محمد الیاس میراں پوری

لیکچرار، گورنمنٹ ڈگری کالج، مخدوم رشید

معنویت اور فیض

Muhammed Ilyas Meeranpuri

Lecturar,Governmet Degree College, Makhdoom Rasheed

Semantics and Faiz

The greatness of Faiz's poetry draws upon his distinct, novel and exquisite use of lexis with stylistic variations. There is a definite link of his poetry with the classical tradition which uses comprehensive and artistic attributes. Faiz has used these artistic attributes in his own peculiar manner. His poetry definitely, is an amalgam of both art and creativity. His poetry transmits meaning elaborately and succintly. In this research paper, excerpts from Faiz's poetry have been discussed with regard to their tendency to change meaning change their meanings with change in accent.

کسی شعر کی مختلف انداز سے قرأت، اس کے معنی میں اضافہ کر دیتی ہے۔ کیوں کہ لہجہ اپنے اندر معانی کے کئی جہان لیے ہوتا ہے۔ ادب کے عام قاری اور تنقیدی قاری میں یہی فرق ہے کہ وہ کسی شعر کی پہلے قرأت سے نمودار ہونے والے معانی پر قناعت نہیں کرتا بل کہ اس کے تہہ در تہہ معانی کو ڈھونڈ نکالتا ہے۔ کیوں کہ ہر فن پارہ اس بات کا متقاضی ہے کہ تشریح و توضیح سے بڑھ کر اس کی تعبیر کی جائے۔ کسی شعر کی پہلی قرأت اس کے معنی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں شمس الرحمٰن فاروقی نے بڑی خیال انگیز بات کی ہے:

”کوئی فن پارہ دو حال سے خالی نہ ہوگا:

(۱) فن پارے کے معنی صرف وہی نہیں جو پہلی قرأت پر ہماری سمجھ میں آئے تھے؛ یا

(۲) فن پارے میں اتنے ہی معنی نہیں جتنے پہلی قرأت پر ہمیں نظر آئے تھے۔“(۱)

جب ہم کسی تخلیقی شہ پارے میں کہتے ہیں کہ اس میں تخلیقیت کے بھرپور عناصر ہیں اور تو پھر اس بات پر بھی ایمان لایا جا سکتا ہے کہ اس کی تفہیم کو بھی روایتی طریقے سے ہٹ کر دیکھا جائے۔ کسی شعر کی تفہیم، اُس کی قرأت اور اُس کے لہجے سے ظاہر ہوتی ہے۔ تفہیمِ شعر کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل عباس بلوچ کہتے ہیں:

”فارسی ادب میں ایک اصطلاح عاطفہ ہے۔ اس میں پانچ عناصر مل کر کسی متن کی تفہیم کو آسان کرتے

ہیں: (۱) جذبہ (۲) تخیل (۳) اسلوب (۴) معانی (۵) لہجہ۔'' (۲)

کسی تخلیقی شہ پارے کی حقیقی تفہیم اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اُس کی تنقیدی قرأت (بل کہ تعبیر) نہ کی جائے کیوں کہ بقول ڈاکٹر ناصر عباس نیر ''قرأت ادب پارے کے ''متنِ مردہ'' کو بہ طرزِ مسیحا زندہ کرتی ہے۔'' (۳)

جب ہم کسی شعر کی قرأت کرتے ہیں اور معنی جاننے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس تخلیقی شہ پارے کے مخفی معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ متن کی تشریح اور توضیح ایسا عمل ہے جو کسی تخلیقی شہ پارے کے بنیادی ارکان (مصنف، متن، قاری) کے ذریعے ہی تکمیل پذیر ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں قاضی افضال حسین کا کہنا ہے:

> ''متن کی تشریح اور تفہیم ایک دائروی عمل ہے۔ جس کے تین بنیادی ارکان، مصنف، متن اور اس کے قاری ہیں۔ شارح کے نزدیک ان تینوں میں سے کسی ایک کی ترجیح یا مرکزیت تشریح کے مخصوص دبستان کی تشکیل کرتی یا اسے مخصوص دبستان سے منسلک کرتی ہے۔'' (۴)

کلامِ فیض کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے لفظیات کو ایک نیا انداز اور منفرد اسلوب دیا۔ فیض کے کلام میں وہ جملہ فنی محاسن ملتے ہیں جو کلاسیکی شعری روایت کا حصہ تھے اور جنھیں فیض نے نئے پیکر میں ڈھال کر جدید شعریت روایت سے مملو کیا۔ کلامِ فیض میں موجود صنعتیں صرف خالی صنعت سازی نہیں ہے۔ یہ کبھی بھی معنی اور ابلاغ کا خون نہیں ہونے دیتیں۔ معنی اور ابلاغ کی ترسیل بدرجہ اتم موجود ہے جو قاری کو ایک نئے لطف سے آشنا کرتی اور اس کے تذویق وتشویق میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی، جو فیض کے پسندیدہ نقادوں میں سے ہیں۔ انھی کے بارے میں فیض صاحب نے کہا تھا: ''ڈاکٹر محمد علی صدیقی میرے پسندیدہ نقادوں میں سے ہیں۔'' (۵)

انھوں نے فیض کے فن کے بارے میں کہا ہے:

> ''فیض کا بنیادی کمال یہ ہے کہ انھوں نے اکہرے مفاہیم کے تلازموں کو نئے تصورات دیے۔ روایتی تلازمے (Allegories) اور استعارے صرف اسی فنکار کے یہاں تہ دار ہو پاتے ہیں جو قدیم اور جدید کے خانوں میں منقسم نہ ہو پایا ہو۔ وہ اپنے جدید میں تمام تر صحت مند قدیم کا دلدادہ ہو اور اپنے قدیم میں تمام تر ممکنہ جدید کا وکیل ہو۔ فیض نے ارنسٹ فشر (Ernst Fisher) کی طرح اپنی شعری لغت کو اپنے وقت کی نظریاتی حدود سے ماورا کر لیا ہے۔ فیض کی شاعری اپنے عہد کی ایک طاقت ور فکر کی عکاس ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ آزادی کے بعد شاعری میں وہ بتدریج زیادہ سیاسی لب ولہجہ اختیار کرتے ہوئے ملتے ہیں۔'' (۶)

فیض کی شاعری کا آرٹ، موضوع، مواد، اظہار، لہجہ، فنی رویے اور زبان کا ایسا گاڑھا اور یک جان قوام ہے کہ اس میں یہ ممکن نہیں کہ ہم فیض کے موضوعات کو ان کی امیجری، تشبیہات، استعاروں اور زبان و بیان کی دوسری فنی بنت سے علاحدہ کر کے اسی طرح گفتگو کر سکیں جس طرح دیگر کلاسیکی یا جدید شعرا پر بات کی جا سکتی ہے۔ بلاشبہ فیض صاحب نے اردو شاعری کو نئے استعارے، تشبیہات اور تلازمے دیے ہیں۔

یہ فنی خوبیاں کلام کی معنویت میں بے پناہ اضافے کا باعث بنی ہیں۔ لفظ سے لفظ اور بات سے بات نکلی ہے۔ فیض کا شعری سرمایہ ایسی خوبیوں

سے مزین ہے۔ لہجے کی چاشنی اور الفاظ کی ندرت اس میں سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے۔ کیوں کہ فیض نے الفاظ کو عام پیرائے کی بجائے ایک خاص پس منظر میں استعمال کیا ہے جو بھرپور تخلیقیت کا حامل ہے۔ ایک عام شاعر کوشش کرتا ہے کہ الفاظ لغت سے خارج نہ ہوں۔ وہ ایک خاص دائرے میں رہ کر ادب پارہ تخلیق کرتا ہے لیکن فیض کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے الفاظ کا اس طرح تخلیقی استعمال کیا ہے کہ یہ ایک الگ لغت تیار کی جاسکتی ہے۔ فیض کے علائم، استعارے اور تلازمے بہت خوبصورت اور دلکش ہیں۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر شارب ردولوی رقم طراز ہیں:

> ''فیض کی سب سے بڑی خصوصیت ان کے کلا میں لفظ کا تخلیقی استعمال ہے۔ الفاظ کو نظم کردینا، خیال، محسوسات، تجربات اور مشاہدات کو خوبصورت پیرائے یا مترنم انداز پیش کردینا الگ بات ہے۔ ہر عہد میں شعراء اپنے جذبات اور محسوسات کو پیش کرتے رہے ہیں۔ ایک عام شاعر لفظ کو اُس کے معنی اور لغت کی حدود میں نظم کرتا ہے۔ اُسے یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ بات، زبان اور محاورے کے خلاف نہ ہو، لیکن ایک عہد ساز شاعر کے یہاں لفظ لغت کے دائرے سے نکل کر ایک وسیع دنیا بن جاتا ہے۔ اُس کے یہاں الفاظ اور استعارات کے معنی اُس کے تخلیقی استعمال سے متعین ہوتے ہیں۔''(۷)

اس میں کوئی شک نہیں کہ فیض صاحب کا لفظیاتی نظام مروجہ لغت سے ہٹ کر ہے۔ انھوں نے اس نظام کے تحت معنی کا ایک جہان آباد کیا۔ جو بھرپور تخلیقیت کا علمبردار ہے۔

فیض صاحب کے کلام میں معنیاتی لہجے تلاشنے سے قبل لہجے کے بارے میں جان لیں کہ لہجہ کونسی اصطلاح ہے۔ اس کے معنی و مفہوم کیا ہے۔ J.A. Cuddon نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے:

"The emphasis or stress(q.v.) placed on a syllable, especially in a line of verse. It is a matter of vocal emphasis. Where the accent comes will depend how the reader wishes to render the sense. In the following lines the metrical stress is fairly clear, but the accents can be varied."(8)

کسی ادب پارے کی قرأت سے پتا چلتا ہے کہ یہ لہجہ کس تخلیق کار کا ہے۔ اس لہجے کی بنا پر ہم تخلیق کار تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کی وضاحت انور جمال نے کچھ اس طرح کی ہے:

> ''شعری تنقید کی اصطلاح ہے۔ بیان کے اسلوبِ خاص کا دوسرا نام ''لہجہ'' ہے۔ جب کسی فن پارے میں علویت (Sublimity) کی شان پیدا ہوجاتی ہے تو وہ انفرادیت کی عظمت حاصل کر لیتا ہے اور اپنے قبیل کے سینکڑوں فن پاروں میں اپنے خالق کی شناخت کراتا ہے۔ شاعری میں لہجہ، شاعر کے انفرادی اسلوب (Style) کا متبادل ہے۔ لہجے کی اسی انفرادیت کے باعث ہم عموماً پہچان لیتے ہیں کہ یہ شعر غالب، اقبال، مومن یا نظیر اکبر آبادی کا ہے۔ نفسیاتی نقطہ نگاہ سے ہر شاعر Unique شخصیت کا مالک ہے۔ چناں چہ Man is style himself کہا گیا۔ یوں ہر شاعر کا اپنا آہنگ، رنگ اور لہجہ ہے۔''(۹)

فیض صاحب کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن کو اگر لہجہ بدل کر پڑھا جائے تو یہ کثیر المعانی کے زمرے میں آتے ہیں۔ الفاظ ومعانی کی یہ کثرت بہت کم شاعروں کے حصے میں آئی ہے۔

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

ان اشعار میں نئی معنویت کی وسعت اور لہجے کی فراوانی ہے۔ اگر لب ولہجہ تبدیل کر کے ان اشعار کو پڑھیں تو ہمیں اس میں الفاظ ومعانی کی گہرائی اور کثیر الجہتی نظر آتی ہے۔ یہاں ایک طنز ہے، حسرت ہے ، خواہش ہے، رشک ہے اور شکست کی آواز ہے۔ ''تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں'' کو کئی انداز سے پڑھا جاسکتا ہے۔ مثلاً:

(۱) کیا تجھ سے واقعی کھیلی ہیں؟ ایسا نہیں ہوسکتا۔ (غیر یقینی کیفیت)
(۲) تجھ سے کھیلی ہیں، واقعی تجھ سے کھیلی ہوں گی۔ (یقینی کیفیت)
(۳) حیرت ہے، تجھ سے کھیلی ہیں۔ (حیرت واستعجاب)
(۴) ہم سے تو نہیں کھیلی، تجھ سے کھیلی ہیں۔ (بے پروائی)
(۵) تجھ سے کھیلی ہیں، ہوسکتا ہے تجھ سے کھیلی ہوں۔ (امکان)
(۶) تجھ سے کھیلی ہیں، تو مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ (لاتعلقی)
(۷) تجھ سے کیوں کھیلی ہیں؟ (وجہ؟)

اسی طرح اسی نظم کے دوسرے بند ''تجھ پہ بھی برسا ہے اُس بام سے ماہتاب کا نور'' کو اسی انداز سے پڑھیں تو اس کے نئے نئے مطالب اور معانی نظر آتے ہیں۔ مثلاً

(۱) تجھ پہ بھی برسا ہے؟ یقین نہیں آرہا (طنز اور تضحیک واستہزاء)
(۲) تجھ پہ بھی برسا ہے، مجھ پہ بھی برسے تو کتنا اچھا ہو (رشک کی کیفیت)
(۳) تجھ پہ بھی برسا ہے، کسی اور پر بھی برسا ہوگا، (عمومیت کا تصور اور بے پروائی)
(۴) تجھ پہ برسا ہے، مجھ پہ کیوں نہیں برستا (حسد کی کیفیت)

فیض کے مجموعے ''دستِ صبا'' کی نظم ''دو عشق'' بھی اپنے اندر معنویت کا ایک جہاں لیے ہوئے ہے۔ اس نظم میں بیک وقت اتنی خوبیاں اور معنیاتی لہجے پوشیدہ ہیں کہ اس کی ایک ایک پرت کھولتے جائیں نئے نئے منظر اور نئی نئی کیفیات نظر آتی ہیں:

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں

''تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے'' اس مصرعے میں ''کیا کیا'' کی تکرار نے فکر وتخیل کو کئی نئی آوازوں سے آشنا کیا ہے۔ اگر اس مصرعے

کے دو حصے ''تنہائی میں کیا کیا'' اور ''نہ تجھے یاد کیا ہے'' کر کے پڑھیں تو اس کے لب و لہجے میں کتنا صاف اور واضح فرق محسوس ہوتا ہے۔ یعنی میں نے جب تجھے یاد ہی نہیں کیا' تو پھر میں نے کیا ہی کیا ہے؟ اسی طرح دوسرے مصرعے میں بھی ''کیا کیا'' کی تکرار نے کئی پوشیدہ معانی کو وجود کا پیکر دے دیا ہے۔ ''کیا کیا'' پڑھ کر بعد میں یہ پڑھیں ''نہ دل زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں'' تو اس مصرعے میں کتنی خوبصورتی، کشش اور وسعتِ معانی ہے۔

''زنداں نامہ'' کی نظم ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' کا ایک شعر اپنے اندر لب و لہجے کے کتنے زاویے لیے ہوئے ہے اور اس کے کتنے شاندار و دلکش معانی نکلتے ہیں:

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے عَلَم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

اس شعر کے لہجے کی مختلف جہتوں کو ملاحظہ فرمائیں:

(۱) یہ قافلے جو نکل رہے ہیں علم چن کر نکلیں گے۔ (ابتدائے سفر)
(۲) اور قافلے بھی نکلیں گے؟ (خواہش)
(۳) ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اور قافلے نکلیں (اُمید)
(۴) اور قافلے نہیں نکلیں گے۔ (یاس کی کیفیت)
(۵) کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اور قافلے نکلیں؟ (خواہش)
(۶) اور قافلے نہیں نکلیں گے۔ (انکار کی کیفیت)
(۷) اپنے علم نہیں ہیں، جو ہمارے علم چنیں گے۔ (ملکیت کا تصور)
(۸) ہمارے علم چنے بغیر قافلے نہیں نکل سکتے۔ (مجبوری کا عالم)
(۹) ہمارے علم چنے بغیر قافلے نہیں نکلیں گے۔ (چننے کا شوق)

ملاحظہ کریں کہ ایک شعر کے کتنے معانی، کتنی جہتیں اور کتنے لہجے ہیں جو تہہ در تہہ اور پرت در پرت کھلتے چلے جاتے ہیں۔ ایک ایک لفظ میں جہانِ معنی آباد ہے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ فیض نے روایتی رموز و علائم اور الفاظ کو نئے معانی عطا کیے ہیں۔ وہ علائم جو اردو شاعری کے مرکزی ساختیے تھے اور جن کی بنا پر اردو نظم عموماً اور اردو غزل خصوصاً سراپا اعزاز گردانی جاتی تھی، فیض نے انھیں نئے پیکر میں ڈھال کر اسے حیاتِ جاوداں عطا کی۔ مثلاً: عاشق، معشوق، رقیب، عشق، وصل، ہجر، فراق، رند، شراب، ساقی، شیخ، مجاہد، زنداں، دار و رسن، گل......

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ان علائم کی وضاحت کچھ اس انداز میں کی ہے:

۱۔ عاشق (مجاہد، انقلابی)، معشوق (وطن، عوام)، رقیب (سامراج، سرمایہ داری)
۲۔ عشق (انقلابی ولولہ، جذبۂ حریت)، وصل (انقلاب، آزادی، حریت، سماجی تبدیلی)، ہجر، فراق (جبر، استحصال کی حالت یا انقلاب سے دوری)
۳۔ رند (مجاہد، انقلابی، باغی)، شراب، میخانہ، پیالہ، ساقی (سماجی اور سیاسی بیداری کے ذرائع)، محتسب، شیخ (سامراجی نظام، سرمایہ

دارانہ ریاست،عوام دشمن حکومت)

۴۔ جنون (سماجی انصاف، انقلاب کی خواہش، تڑپ)، حسن، حق (سماجی انصاف، انقلاب، سماجی سچائی)، عقل (مصلحت کوشی، منفعت اندیشی، جابر نظام، دفتر شاہی یا عسکری نظام سے سمجھوتہ بازی)

۵۔ مجاہد (مجاہدِ آزادی، انقلابی)، زنداں، دارورسن (سیاسی قید، پھانسی، جان کی قربانی)، حاکم (سامراج، سرمایہ داری، تانا شاہی، عسکری نظام)

۶۔ بلبل، عندلیب (جذبہ قومیت، حریت سے سرشار شاعر، انقلابی)، گل (سیاسی آدرش، نصب العین)، گل چیں، قفس (سیاسی نصب العین کے حصول میں رکاوٹ یا رکاوٹ ڈالنے والے عوامل) (۱۰)

نمونے کے طور پر چند اشعار ایسے پیش کیے جا رہے ہیں جن میں فیض نے علائم کو نئے پیکر میں ڈھالا ہے:

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

فقیہِ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

محتسب کی خیر ، اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا ، ساقی کا ، مے کا، خُم کا ، پیمانے کا نام

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

میخانے کی رونق ہیں، کبھی خانقہوں کی
اپنالی ہوس والوں نے جو رسم چلی ہے
دلدارئ واعظ کو ہمیں باقی ہیں ورنہ
اب شہر میں ہر رندِ خرابات ولی ہے

مقام، فیض! کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

کون قاتل بچا ہے شہر میں فیضؔ
جس سے یاروں نے رسم و راہ نہ کی

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے

آیئے ہاتھ اٹھائیں ، ہم بھی
ہم جنھیں رسمِ دعا یاد نہیں
ہم جنھیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بت، کوئی خدا یاد نہیں

کلامِ فیض پر ابھی تک اس سطح کا کام نہیں ہوا جیسا کہ یہ متقاضی ہے۔ جدید تنقیدی تھیوری کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تخلیق سے شخصیت کو الگ کر کے کام کیا جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ادب پارے کی تفہیمِ نو Close Text Reading کے ذریعے کی جائے۔

ہر عہد کسی نہ کسی نابغہ ہائے روزگار سے منسوب ہوتا ہے۔ بلاشبہ آج کا دور بقول ڈاکٹر محمد علی صدیقی فیض کا دور ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''فیض احمد فیض کی شاعری مستقبل آفرینی کے عمل کی شاعری ہے۔ یہ سرتا سر حسن کی شاعری ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم جس شعری دور میں زندہ ہیں وہ فیض احمد فیض ہی سے عبارت ہے۔ وہ شاعر کیا ہے، جادوگر ہے۔''(۱۱)

حواشی وحوالہ جات

(۱) فاروقی، شمس الرحمٰن، ''صورت ومعنیٔ سخن''، کراچی، آکسفر ڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۱ء، ص ۲۰

(۲) سہیل عباس بلوچ، ڈاکٹر، ''اردو اسلوبیات کی تشکیلِ نو''، مطبوعہ ''معیار'' اسلام آباد، شعبۂ اردو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، شمارہ ۲، جولائی۔ دسمبر ۲۰۰۹ء، ص ۲۷۹

(۳) ناصر عباس نیر، ڈاکٹر ''جدید اور مابعد جدید تنقید''، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۱

(۴) افضال حسین، قاضی، ''تحریر اساس تنقید'' علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۹ء، ص ۹۰

(۵) فیض احمد فیض، روزنامہ ''جنگ'' ۱۳رفروری ۱۹۸۳ء

(۶) محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، مضمون ''فیض احمد فیض اور روایتی شعری زبان''، مشمولہ '' ادبیات (فیض نمبر) شمارہ ۸۲، (جنوری تا مارچ ۲۰۰۹ء) ص ۱۳۰، ۱۳۱

(۷) شارب ردولوی، ڈاکٹر، مضمون ''فیض کی شعری جہات، تعین قدر کا مسئلہ'' مشمولہ ''ماہِ نو'' (بیادِ فیض)، مئی جون ۲۰۰۸ء، ص ۲۵۹

(8) Cuddon, J.A. "The Penjfuin Dictionary of Literary Terms and Literary Theory" (4th Edition,Pg.5

(۹) جمال، انور، ''ادبی اصطلاحات''، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۸ء، ص ۹۵

(۱۰) گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، مضمون ''فیض کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی نظام'' مشمولہ ''ادبیات'' (فیض نمبر) اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، شمارہ ۸۲، جنوری تا مارچ ۲۰۰۹ء، ص ۵۱، ۵۲

(۱۱) محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، ''فیض احمد فیض۔ درد اور درماں کا شاعر''، لاہور، پیس پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۵۲

(۱۲) فیض، فیض احمد، نسخہ ہائے وفا، لاہور، مکتبہ کارواں، سن ندارد